اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈراموں میں صوفیانہ عناصر

امجد علی☆
Amjad Ali
محمد سلمان بھٹی☆☆
Muhamad Salman Bhati

Abstract:

Mysticism and spiritualization have deep effects on Urdu literature. These effects also accepted by Ashfaq Ahmad and BanoQudsia. Both of them have deep relation with mysticism and saints. This is the reason that much of their work is about mysticism and spiritualization. Although mysticism is also finds in their novels and short stories (Afsana). But here our aim is to analyze the common mystic elements in Ashfaq Ahmad and BanoQudsia's Urdu dramas.

کلیدی الفاظ:

تصوف۔روحانیت۔اشفاق احمد۔ بانو قدسیہ۔حقیقت۔وجدان عشق۔عرفان ذات۔ سائنس۔ خلقت۔

تصوف اور روحانیت کے ہمارے ادب پر گہرے اثرات ہیں۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ دونوں صوفیااور تصوف سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں جابجاروحانیت اور تصوف کی کلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں بھی تصوف نمایاں ہے۔ لیکن یہاں ہمارا مقصد ان دونوں ڈرامہ نگاروں کے اردو ڈراموں میں صوفیانہ عناصر کا جائزہ لیناہے۔

تصوف نظری اور عملی اعتبار سے حقائق آفاق سے اعراض کئے بغیر ذات کبریا کی قربت،اس کی رضااور اپنے نفس کا عرفان حاصل کرنا ہے۔اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی

☆ پی ایچ ڈی سکالر،یونیورسٹی آف ایجوکیشن،لوئرمال کیمپس،لاہور۔
☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اُردو،یونیورسٹی آف ایجوکیشن،لوئرمال کیمپس،لاہور۔

چاہئے کہ ان غایتوں کا تعلق انسان کے روحانی تجربات اور اس کی نفسی کیفیات سے ہے اور چونکہ یہ ایک خلقی رویہ ہے اس لئے ذات کبریا اور باطن کی جانب انسان کا رجحان اس کی خلقت اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس رجحان اور میلان کا کوئی پہلو، خواہ وہ حقیقت و آگہی کی کسی منزل میں ہو، فطرت انسانی سے مغائرت نہیں رکھتا بلکہ یہ انسان کے شعور اور ادراک کا مستقل تقاضا ہے کہ وہ مبدا حقیقی سے قریب تر ہو جائے اور اپنی ذات کی گہرائیوں سے آشنا ہو، اپنے دامن میں ڈوبے، اپنے باطن میں اس ذوق لذت کے ساتھ سفر کرے کہ اس کی روح کو نشاط ابدی کا کیف حاصل ہو جائے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

ایک ایسا کلیہ ہے جو نہ صرف انسان اور اس کے وجود کی اہمیت کو متعین کرتا ہے بلکہ اس حیرت خانہ عالم میں اس کو بے بسی اور بے چارگی کے احساس سے نجات دلاتا ہے۔ اس حیثیت سے اپنی ذات کا وہ علم موثق و معتبر کلیہ ہے۔ جس سے حیات و کائنات کے پیچیدہ اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ اور وجود و عدم کے طلسمی تضاد حل ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں جلال الدین رومی کی زبان سے زندگی اور خودی کے تعلق کو اس طرح بیان کیا ہے۔ زندہ یا مردہ یا جان بلب۔۔۔ از سہ شاہد کن شہادت را طلب۔۔۔ شاہد اول شعور خویشتن۔۔۔ خویش را دیدن بہ نور خویشتن۔۔۔ شاہد ثانی ۔۔۔ شعور دیگری ۔۔۔ خویش را دیدن نہ نور دیگری۔۔۔ شاہد ثالث شعور ذات حق۔۔۔ خویش را دیدن بہ نور ذات حق۔ ترجمہ: تو زندہ ہے یا مردہ ہے جان بلب ہے ان تین شاہدوں سے شہادت طلب کر۔ پہلا شاہد تیرا اپنا شعور ہے یعنی اپنے آپ کو اپنے نور (خودی) سے دیکھنا۔ دوسرا گواہ دوسرے کا شعور ہے اپنے آپ کو دوسرے کے نور سے دیکھنا۔ تیسرا شاہد ذات حق کا شعور ہے اپنے آپ کو ذات حق کے نور سے دیکھنا۔

اس میں شک نہیں کہ عرفان نفس کے باب میں اقبال کے خیالات کی اساس اسلامی فکر پر قائم ہے لیکن صوفیائے اسلام نے عرفان و آگہی کا سفر فکر کے ذریعے طے نہیں کیا ہے اس منزل میں ان کا خضر راہ وجدان اور ذوق عشق ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور عالم خارجی کی تخلیق عشق ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاوں تو میں نے خلق کو تخلیق کیا۔

اردو ادب نے بیسویں صدی میں مغرب سے بہت گہرے اور واضح اثرات قبول کئے۔ رومانویت، ترقی پسندی، علامتیت، تجریدیت کی منازل طے کرتے ہوئے ہمارا ادب جب روحانیت اور تصوف تک پہنچا تو اسے قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسے دانشور ملے۔ جنہوں نے اپنی تحریروں کو جدید نظریات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ان میں روشنی کی چاشنی شامل کر کے اپنے پڑھنے والوں کو بتایا کہ زندگی کی بے رنگ فضاوں پر قوس قزاح تب ہی نظر آتی ہے جب اندر کی آنکھ کھلی ہو جسے اقبال لازم قرار دیتے ہیں۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب۔۔۔ آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں۔

صوفی دانشوروں کے اس گروہ میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نام اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے نہ صرف تحریر بلکہ اپنے خوبصورت اور مسحور کن انداز گفتگو سے بھی نوجوان نسل کی راہنمائی کی۔ انہوں نے جس صوفیانہ انداز سے بالکل غیر محسوس طور پر خدمت خلق، صلہ رحمی، محبت، احسان اور خلوص کے رویوں کو فروغ دیا اسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اشفاق احمد کا شمار ہمارے ادب کے ان چند خوش قسمت ترین ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں ان کی زندگی میں پرستاروں کی عقیدتوں کو وہ حصہ ملا جسے کسی ادیب کے نام کرنے کے لئے ہمارا مشرقی مزاج اکثر اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ ان کی اسی شہرت و مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی تحریر و تقریر کا صوفیانہ پہلو بھی ہے۔ ۷ ستمبر ۲۰۰۴ کو ان کے دار فانی سے رخصت کے بعد اخبارات و رسائل، ٹیلی ویژن، ریڈیو نے انہیں جس طرح خراج تحسین پیش کیا اس کی ایک جھلک ہم اس خط میں دیکھ سکتے ہیں جو ان کے فکر انگیز تصوف کا بہت خوبصورت ادراک و اعتراف ہے۔

"پیارے باباجی السلام علیکم!

آپ کی دعاوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پہ سلامت رہے، پاکستان ٹیلی ویژن کی مٹی آپ کی دعاوں کے وتر سے گوندھی ہے دن رات چاک گھما گھما کر اس کی شکل بنائی۔ اپنی پھونک سے اس کو زندہ کیا۔ انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ لکن مٹی کھیڈ کھیڈ کر بھاگنا، دوڑنا اور جستجو کرنا سکھایا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کا مہاندرا، چال ڈھال اور ولولہ جس ریاضت اور کسرت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ وہ سب آپ کی نگرانی، توجہ اور مہربانی کے طفیل ہے۔ آپ نے مجاز کی رنگ برنگی کھیسی اتار کر حقیقت کی چٹی چادر تان لی ہے، پردہ کر لیا مگر ہم جانتے ہیں "گورپیا کوئی ہور۔" آپ تو زندہ ہیں بلکہ زندہ جاوید۔ اپنی تحریروں میں پی ٹی وی کے ڈراموں میں "ٹاہلی تھلے" کی بیٹھک اور

"زاویہ" کی نشستوں میں ہم پاکستان ٹیلی ویژن والے آپ کے سکھائے سدھائے آپ کا کام جاری رکھیں گے۔ ہم کل بھی آپ کی دعاوں کے سائل اور طالب تھے، آج بھی ہیں کہ وہ شجر جسے دنیا پاکستان ٹیلی ویژن کے نام سے جانتی ہے سدا پھلتا پھولتا بہاریں دکھاتا رہے۔ ہم آپ کی اس دعا پر آمین کہتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

والسلام

آپ کا بیٹا

پاکستان ٹیلی ویژن"[۱]

اشفاق احمد نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی گلیمرس اور رنگ و بو کے اس دور میں بھی انہوں نے پی ٹی وی پر اپنا لوہا منوایا۔ وہ اگرچہ صوفی تھے لیکن ڈرامہ نگاری میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ ان کے مطبوعہ ڈراموں میں "ایک محبت سو ڈرامے"، "توتا کہانی"، "بند گلی"، "اور ڈرامے"، "ننگے پاوں"، "مہمان سرائے"، "حیرت کدہ"، "شاہلا کوٹ"، "من چلے کا سودا" اور "ٹاہلی تھلے" شامل ہیں۔

ان کے مجموعہ "ننگے پاوں" میں شامل "چور بخار" گہری معنویت کا حامل ہے۔ اس کے دو مرکزی کرداروں کی گفتگو ملاحظہ فرمائیں:

"چور۔۔۔(کرسی کی پرواہ کئے بغیر اسی طرح کھڑے کھڑے) میری زندگی کے تاریک ترین دنوں میں یہ روشن رات امید کا سورج بن کر ابھری ہے۔ پتہ نہیں اس رات کو کسی نے کب ٹک مارک کیا تھا۔

مریم:۔۔۔میں سمجھتی ہوں آپ کا آنا ایک فرشتہ رحمت سے کم نہیں آپ کی وجہ سے میرے بلو کو نئی زندگی ملی ہے۔

چور:۔۔۔یہ تو خیر غلط ہے بلو کو تو زندہ رہنا ہی تھا، خدا کے فضل سے اور وہ رہے گا۔ انشااللہ لیکن اس کی وجہ سے میں زندہ ہو گیا ہوں۔

مریم: بلو کی وجہ سے؟

چور: ۔۔۔آپ لوگوں کی وجہ سے، آپ دونوں کی بدولت۔۔۔میں سمجھتا ہوں جیسے میں زندہ ہی نہیں ہو گیا بلکہ ایک بزرگ سا بھی ہو گیا۔ ایک ولی اللہ، ابدال، قطب۔

مریم: ۔۔۔(خوب ہنس کر) وہ تو چوروں سے بنا کرتے ہیں۔

قطب! آپ کوئی چور ہیں خدانخواستہ

چور۔۔۔ آپ لوگوں نے مجھے بہت کچھ عطا کیا ہے۔"(۲)

اشفاق احمد انسان سے انسان کے تعلق اور خدمت خلق کے جس رویے کی ترویج کرنا چاہتے ہیں وہ اس مکالمہ سے نمایاں ہے۔ وہ نہ صرف انسان کو دنیا اور آخرت کے تعلق کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں بلکہ انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے نجات دلاتے ہیں۔ تصوف میں انسان ٹکڑوں میں بٹنے سے بچ جاتا ہے اور اسے اپنی ذات کی شناخت ہو جاتی ہے اور وہ انسانوں کی بھلائی کے لئے خود کو وقف کر دیتا ہے۔

"ننگے پاوں" میں شامل ایک اور کھیل "ڈھورڈنگر" میں وہ اپنے خاص لب و لہجے میں دور جدید کے علم پر طنز کرتے نظر آتے ہیں جس سے انسان کو صرف دماغ کا پتہ دیا ہے دل کا نہیں۔ اس ڈرامہ کا ایک کردار، جو اگرچہ ان پڑھ ہے لیکن مخلص اور زندہ دل ہے وہ اپنی بے علمی پر کس معصومیت سے ماتم اور آہ زاری کرتا ہے وہ اشفاق احمد کے صوفیانہ انداز کے حوالے سے قابل غور ہے:

> "بابا: کل علم والوں نے یہی لکھا ہے صاحب اپنی کتابوں میں کہ ان پڑھ بندہ خدا کو بھی نہیں جان سکتا (ایک دم رو کر) خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ کوئی زندگی ہے صاحب ہمارے جیسے جانوروں کی۔ ڈنگروں کی (سسکیاں بھر کر رونے لگتا ہے)۔"(۳)

اس ڈرامہ میں دور حاضر کے المیہ مادیت کو کم تعلیم یافتہ ہیرو کے خط کی آواز میں یوں قلمبند کرتا ہے۔

> "آواز۔۔۔۔ میں تمہیں تھوڑی سی اجازت نہیں، پوری اجازت دے رہا ہوں۔ یہ دور ہی ایسا ہے۔ کوئی ان پڑھ کسی پڑھے لکھے سے دیر تک عزت کروا ہی نہیں سکتا۔ تمہارا قصور نہیں نادیہ، نہ ہی اسد اللہ کا قصور ہے۔ یہ دور ہی ایسا ہے، دماغ ساری بازی جیت گیا ہے، دل کے لئے اب کوئی یہیں نہیں رہا۔"(۵)

تصوف نہ صرف خود کو سنوارنے کا نام ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ بہتر رویے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد فرد اور معاشرے کے تعلق کو بہتر بنانے کے لئے، اخلاقی اقدار کو اپنانے کی بات کرتے ہیں اور انہی روایات سے رشتہ مضبوط رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ اشفاق احمد اپنے

کرداروں کے ذریعے اس قدر غیر محسوس طریقے سے اپنی نصیحت کا ابلاغ کرتے ہیں کہ کہیں بھی نصیحت نہیں لگتی۔ان کے ڈرامہ ''مہمان سرائے'' میں ایک کردار صاحب کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔

> ''آئی ایشوریو مینجر صاحب کہ اگر پاکستان کے لوگ میری کتاب کا ایک صفحہ بھی پڑھ لیں تو ان کے ذہن سے منی میکنگ کا بھوت فوراً نکل جائے (اٹھتے ہوئے) بٹ دے آر ان فورچونیٹ۔۔۔اے رئیل ان فورچونیٹ لوٹ!''(۵)

چونکہ تصوف اشفاق احمد کا بنیادی حوالہ ہے اور صوفیا انسان کی اصل، اس کی جڑوں اور حقیقت کو بہت اہم خیال کرتے ہیں۔جو قومیں اپنے اسلاف کی روایات سے رشتہ توڑ دیتی ہیں اپنی جڑوں سے کٹ جاتی ہیں اور پھر جلد ہی اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ایسی قوموں کا وجود ہمیشہ کے لئے زمین سے مٹ جاتا ہے۔اور آہستہ آہستہ ان کی یادوں کے نقوش بھی دھندلا جاتے ہیں۔

''بند گلی'' ان کے مطبوعہ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔''بند گلی'' میں شامل ایک ڈرامے ''ناطے دار'' میں اس حوالے سے اشفاق احمد کا پیش کردہ کردار عزیز کہتا ہے۔

> ''انسان بھی درخت کی طرح ہوتا ہے نبیلہ جان۔۔۔درخت کی نازک ترین شاخ پر لگا ہوا آخری زرد رو مخملی پتا بھی اپنی جڑوں کو جانتا ہے۔۔۔کوئی اپنی گراس روٹس سے چاہے کتنی ہی بھاگ جائے، اسے اپنی اصلیت پہچاننے میں دقت نہیں آتی۔نیگرو چاہے امریکہ میں بسے چاہے جاپان میں رہے، جب بھی اپنا ہم شکل دیکھے گا اسے افریقہ کا طاس ضرور یاد آئے گا۔''(۶)

اشفاق احمد کے نزدیک تصوف خدمت خلق اور انسانی بھلائی کا نام ہے اور جوں جوں انسانی فلاح کے لئے انسان کے قدم اٹھیں گے اس کے راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے جائیں گے۔اس طرح حقوق العباد اور خدمت خلق جو کہ تصوف کا طرہ امتیاز ہے اور صوفیا نے اسی طرز اپناتے ہوئے اس کی طرف مائل کیا ہے اور اس کے سبب ہی اسلام اشاعت پذیر ہوا۔اشفاق احمد کے تصوف میں خدمت خلق ایک بنیادی قدر ہے ''بند گلی'' میں شامل ایک ڈرامہ ''ماماسیمی'' کے کردار ''رہبر'' کا یہ مکالمہ دیکھیں:

> ''بھائی میرے میں نے سنا ہے، ہو سکتا ہے غلط سنا ہو لیکن سنا ہے کہ نماز کی قضا ہے لیکن خدمت کی نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ جو تم آدھی رات کو میرے پاس آئے ہو تو ضرور کوئی پریشانی ہے۔''(۷)

صلہ رحمی کے حوالے سے اس ڈرامہ کے اسی کردار کا مکالمہ بھی قابل توجہ ہے۔

"معاف کر دو آپا جی، بخش دو، کبھی کبھی خدا کے نام پر روپیہ پیسہ روک کر لوگوں کو معافی کی بھیک بھی دے دینی چاہیے۔ دو آنے کی چار آنے کی معافی۔ بدلے کو قربان کر کے معافی کا صدقہ بھی تو دیا جا سکتا ہے۔"(۸)

اشفاق احمد کا تصوف کہیں بھی جنگلوں، صحراوں میں نکلنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا مطلب راہبانیت نہیں ہے نہ ہی کشف و کرامات ہے۔ نہ ہی اس کا تعلق روحانی طاقت کا حاصل کرنا ہے۔ ممکن ہے ایک " بابا" سے تربیت یافتہ ایم۔اے پاس خاتون کسی امیر کبیر گھرانے کی نوکرانی ہو۔ نفس کشی کے وہ یہی طریقے اپناتے ہیں۔" یزمان کا موچی" میں ایک ایسا ہی کردار ہمیں نوری کے نام سے ملتا ہے جو اپنی مالکن سے بحث ومباحثہ سے بھی نہیں ڈرتی اور وہ مادیت پرستی کا المیہ یوں بیان کرتی ہے۔

آپ امیر لوگ ہر وقت ڈرتے ہیں۔

"The desire to gain wealth Begum Sahib and the fear to lose it are your chief breeders of cowardice and propagators of corruption."(9)

جب بیگم نوری سے سوال کرتی ہے کہ اگر وہ ایسی ہی ایم۔اے پاس ہے تو ان کے برتن کیوں مانجھتی ہے۔"نوری" کا جواب اشفاق احمد کے مسلک تصوف کے مخصوص رجحان کے حوالے سے قابل غور ہے:

یہ میرے بابا"Cobller" کا حکم ہے۔ بیگم صاحب کہ علم، علم کے لئے حاصل کرنا ہے۔ نوکری کی تلاش کرنے کے لئے نہیں۔ نوکری کے لئے علم حاصل کرنے والا اسے اپنے تکبر کا کوڑا بنا کر، ہر ایک کو ٹکٹکی پر کس لیتا ہے۔ بابا جی کا حکم تھا۔

"Learn to rely upon your limbs Noori and to confirm your dress and mode of life not to the new fashions but to the customs your ancestors approved."(10)

اس مجموعہ کے دیگر ڈراموں میں " دو دھاری تلوار"، " ماما سیمی"، "ہے گھات میں نگاہ ستمگر لگی ہوئی"، "ڈمبی سٹی" میں بھی یہ انداز نمایاں ہے۔ اشفاق احمد کا مجموعہ "حیرت کدہ" اپنے اندر حیرتوں کا جہاں لئے ہوئے ہے۔ پہلا ڈرامہ "سونا ملا اور نہ پی ملے۔" اس ڈرامہ میں نوجوان "نواب" نامی کردار کی کہانی بیان کی گئی وہ گاوں کی ایک لڑکی سے وعدہ کر کے دولت اکٹھی کرنے

نکلتا اور راستہ بھٹک جانے پر وہ مائی بلوری کے تکیہ پر جا پہنچتا ہے جو ایک ایسا مزار ہے جس کا منہ غار کی طرف کھلا ہوا ہے اور اس میں مائی بلوری کے بیٹھنے کی جگہ ہے اس مزار کے علاوہ مائی کی جھگی اور چبوترہ بھی نظر آتا ہے۔ مائی بلوری قبر نما مزار کے اندر بیٹھی فارسی کا نعتیہ کلام پڑھ رہی ہے۔ جھگی کے اندر مغلیہ ٹھاٹھ کا کمرہ ہے۔ شہ نشین محرابیں، دیواریں فانوس کی روشنی میں جگمگا رہی ہیں، گویا بہشت کا نمونہ ہے یعنی یہ دنیا نہیں۔ مائی بلوری ایک تخت پر بیٹھی ہے۔ دو مور چھل اسے پنکھا جھل رہے ہیں لیکن خادم نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مور چھل دست غیب سے حرکت میں ہیں۔ یہ سارا ماحول اشفاق احمد کے صوفیانہ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ یہاں مائی بلوری نواب کو راستہ بتاتی ہے اور اس کی مالی مدد کرتی ہے۔ نواب مائی سے بھی رقم کی واپسی کا وعدہ کرتا ہے لیکن نند نا پور آکر جب اس کا کاروبار چل نکلتا ہے تو وہ دولت کے انبار میں اپنے پچھلے وعدوں کو گم کر بیٹھتا ہے اور ایک دولت مند خاتون کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے۔

اس مجموعہ کے دیگر ڈراموں میں "میل ملاپ" ، "بزغالہ اور بچہ زاغ" ، "بہن بھائی"، "فرار" ، "پیغام زبانی اور ہے"، "ایسی بلندی ایسی پستی" ، "نیلی چڑیا"، "آدم زاد" ، "بھوت نکالا" ، "ہیرا من"، "ماسٹر رحمت علی" اور "یہ تیرے پر اسرار بندے" سبھی اپنے اندر صوفیانہ حقائق سمیٹے ہوئے ہیں۔

کہیں کوئی غیبی قوت غربت میں انسان کو مدد فراہم کرتی ہے اور وہ اس کا سہرا اپنے اباواجداد کے سر پر باندھ کر تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اعانت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ (ایسی بلندی ایسی پستی) تو کہیں کوئی پر اسرار ماریو جن کسی سکینہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے (آدم زاد)۔ اشفاق احمد بنیادی انسانی اقدار کے بہت بڑے حامی ہیں۔ ضمیر کی خلش، اندر کا انسان، روح کی تڑپ، یہ سب ان کے بنیادی موضوعات کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں وہ ہر جذبہ کی شدت آشکار کرنے کا گر خوب جانتے ہیں۔ اشفاق احمد اپنی ڈرامہ سیریل" من چلے کا سودا" کا سرچشمہ تصوف کو ہی قرار دیتے ہیں۔

> "اس ڈرامہ سیریل کے وجود میں آنے کا تعلق ان دو مثبت اور منفی تاروں سے بندھا ہے جن میں ایک کا سرچشمہ تصوف اور عرفان ہے اور دوسرے کا منبع سائنس، خاص طور پر فزکس اور فزکس میں سے بھی کوانٹم تھیوری کے ساتھ وابستہ ہے۔"(۱۱)

اس کے نزدیک صوفیا کا علم ابدی اور لافانی ہے۔ اور اس کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''صوفیوں کا علم ایک ایسا ابدی اور عرفانی علم ہے جسے نہ تو عقل و دانش اور دلیل و برہان کے ترازو میں تولا جاسکتا ہے اور نہ ہی الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس ابدی علم کے اندر جدید فزکس کی جو ابدی شاخ اپنے طے شدہ مقام سے گزر رہی ہے اس کو بھی گہرے مراقبے اور ڈائریکٹ حسی، بصیری اور ذاتی مشاہدے سے اس طرح آنکا جا سکتا ہے جس طرح جدید آلات سے فزکس کے مفروضات جانچے جا سکتے ہیں۔''(۱۲)

اشفاق احمد تصوف اور سائنس کے علم کو الگ نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان علوم کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ جس طرح تصوف میں گہرے مراقبے کی اہمیت ہے اس طرح سائنس میں بھی جدید آلات سے مفروضات جانچے جاتے ہیں۔ اشفاق احمد کا تصوف کے ساتھ لگاؤ اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں ''من چلے کا سودا'' کے مجموعے کا انتساب ''نور والوں کے ڈیرے کے نام'' کیا ہے۔ یہ وہی ڈیرہ جہاں بیٹھ کر وہ سائیں فضل شاہ کے ارشادات سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور بقول ان کے وہ تقریباً ساڑھے گیارہ برس تک باقاعدہ نور والوں کے ڈیرے پر حاضری دیتے رہے۔ اور اس سے دگنی مدت وہ ''اردو سائنس بورڈ'' میں مختلف مسودوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ صوفی اور سائنس دان کا سفر اگرچہ ایک ہی سمت میں ہے لیکن ان میں ایک نمایاں فرق ہے۔

''لیکن صوفی اور سائنسدان میں اتنی طویل ہم سفری کے باوجود ایک ہی منزل کی کھوج میں بڑھنے کے باوصف جو ایک نمایاں فرق ہے وہ یہ ہے کہ تصوف میں زندگی کا چلن ہی علم کا مظہر بن جاتا ہے اور حسیات سے ماورا تجربات میں سے گزرنے والا فرد سارے کا سارا تغیر و تبدیل ہو جاتا ہے لیکن سائنس دان ان ماورائی واردات سے متاثر نہیں ہوتا اور یک معروضی انداز میں ویسے کا ویسا کھڑا رہتا ہے۔''(۱۳)

صوفی کی نظر ہمیشہ اللہ پر ہوتی ہے وہ اللہ کی ذات پر ہی توکل کرتا ہے اور اس کو ہی اپنی آقا و مولا سمجھتا ہے۔ اور جو بھی انسان اللہ پر توکل کرے تو ہمیشہ اپنی زندگی میں اللہ کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ ''من چلے کا سودا'' میں ایک کردار ''محمد حسین''، ''ارشاد'' سے مخاطب ہوتا ہے۔

''ارشاد میاں! جب توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر اللہ پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر بہاریں آتی ہیں۔ انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا حال منال، علم و دانش، کمیت تجارت، صنعت و حرفت، رنج و غم اور سود و زیاں جو کچھ بھی ہے اللہ کے لئے۔ پھر وہ طلب دنیا میں ہر ہر قدم پر طلب مولا کو موجود پاتا ہے۔''(۱۴)

تصوف خود کو سنوارنے کا نام نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ بہتر رویے کا نام ہے۔وہ انسان کے تعلق کو اللہ کی ذات کے ساتھ مضبوط کرنے پر زور دیتے ہیں، ان کے تصوف کا مطلب توکل الی اللہ ہے۔تصوف کی دنیا میں من مارنا پڑتا ہے۔اپنی انا ختم کر کے کسی کے حکم کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ اس میں غرور اور تکبر نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔صوفیا ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہنے والے ہوتے ہیں۔ ''من چلے کا سودا'' میں کردار'' محمد حسین'' اور''ارشاد'' کی گفتگو ملاحظہ کریں:

'' (ڈاک خانے کی افرا تفری---مختلف کلرک لفافوں پر مہریں لگا رہے ہیں۔کیمرہ بار بار لفافوں پر مہریں لگاتے دکھاتا ہے۔مہریں کلوزاپ میں دکھائی جاتی ہیں۔اب ایک دروازے سے ارشاد داخل ہوتا ہے۔وہ ایک کھڑکی کے پاس جا کر رکتا ہے۔ یہاں محمد حسین ڈاکیا مہریں لگا رہا ہے۔(ارشاد جا کر کھڑا ہو جاتا ہے) ۔

'' ارشاد: حضور مجھ پر بھی مہر لگادیں----

محمد حسین: جس لفافے پر تیرا پتہ ہی درج نہیں اس پر کیا مہر لگائیں: کہاں بھیجیں اسے؟

ارشاد: پتہ بھی آپ خود لکھ دیجئے آقا!

محمد حسین: دیکھو ارشاد! کہنا آسان کرنا مشکل--- پہلے طریقے سے واقفیت حاصل کر، پھر قدم رکھ۔ غصہ چھوڑ--- تکبر ختم کر---حکم حکومت پر قلم پھیر--- پھر پتہ لکھ دوں گا مہر بھی لگادوں گا---تصدیق کروں گا خود---

ارشاد: لیکن کیسے---کیسے؟طریقہ بھی تو بتائیں حضور!

محمد حسین: دوراستوں پر قدم نہ رکھ---دوئی چھوڑ دے---راستہ ایک ہی بھلا بھائی---بدگمانی چھوڑ---دبدھا سے نکل---

ارشاد: آپ نکال دیجئے سرکار

محمد حسین: ناں بھائی ناں---فیصلہ تیرا اپنا ہوگا---پتہ ہم لکھ دیں گے---تونے تو اپنے لفافے پر اتنا کچھ لکھ رکھا ہے کہ کوئی جگہ ہی نہیں---ہم سرناواں کہاں لکھیں۔ مہر کہاں لگانویں۔''(۱۵)

بانو قدسیہ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے اردو کرنے کے لئے داخلہ لیا تو وہاں اشفاق احمد ان کے کلاس فیلو تھے۔بانو قدسیہ کا نام ''قدسیہ بانو تھا'' لیکن اشفاق احمد نے بدل کر بانو

قدسیہ رکھ دیا۔ اس کے لئے وہ ہمیشہ ان کی احسان مند بھی رہیں اور کئی بار بر ملہ اس کا اعتراف بھی کیا۔

> "بانو قدسیہ نے ہمیشہ اشفاق احمد کا ادب و احترام کیا اس لئے بھی کہ وہ ان کے شوہر ہیں اس لئے بھی کہ وہ ان کے ادبی استاد بھی ہیں۔ جنہوں نے بانو قدسیہ کو واقعی "بانو قدسیہ" بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ رکھا۔ ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی فرمائی۔"(۱۶)

بانو قدسیہ نے اشفاق احمد جیسے ادیب سے فیض حاصل کیا تو ان کا اثر لینا لازمی امر ہے۔ اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ دونوں نے اکٹھے گزارا اس لئے دونوں میں ایک دوسرے کی عادات کا پایا جانا اچنبھے کی بات نہیں۔ اشفاق احمد کی صحبت میں رہ کر بانو قدسیہ کا رجحان بھی تصوف کی طرف ہی مائل تھا۔ بانو قدسیہ کی تحریروں میں بھی اشفاق احمد کی روحانیت کا اثر نظر آتا ہے۔ نہ صرف ان کے افسانے اور ناول اثر اشفاقیت لئے ہوئے ہیں بلکہ ان کے ڈراموں میں بھی یہ تاثر پایا جاتا ہے۔

> "اسماعیل: دس سال ہو گئے مجھے روڈ ماسٹر چلاتے ہوئے۔
>
> کھوکھے والا: بڑا تجربہ ہو گیا۔۔۔ تمہیں تو۔۔۔
>
> اسماعیل: صرف ایک تجربہ ہوا ہے۔۔۔ڈاہڈا۔۔۔ پکا جب سڑک بن جاتی ہے اور روڈ ماسٹر واپس آجاتا ہے سڑک سے۔۔۔ کوئی نہ کوئی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔
>
> کھوکھے والا: وہم ہے تمہارا بھا اسماعیل۔
>
> اسماعیل: جب میلہ ٹوٹے۔ سینما کا شو نبڑے۔۔۔ یا تنبوا کھڑے رشتہ ضرور ٹوٹتا ہے کوئی نہ کوئی۔۔۔ لوگ اکٹھے ہوں اور پھر چلے جائیں۔۔۔ گھر و گھری تو سنسان ہوتا ہی ہے۔۔۔
>
> کھوکھے والا: سچی!
>
> اسماعیل: جب پہلی بار میں سڑک ختم کر کے گھر پہنچا تو ماں موئی پڑی تھی پلنگ پر۔۔۔
>
> کھوکھے والا: افسوس!
>
> اسماعیل: پھر میں ڈیرہ غازی خاں سے سڑک بنا کر آیا۔۔۔ بہن کو رخصت کر دیا بہنوئی کے ساتھ۔۔۔ شادی تو ہوئی پر رشتہ ٹوٹ گیا بہن والا۔"(۱۷)

مغربی تہذیب و ثقافت کے پیروکاروں کو انہوں نے بتایا کہ کوئی درخت اپنی جڑوں سے کٹ کر نہیں جی سکتا۔ اپنے اسلاف کی روایات سے محبت کا درس دیا ہے۔ جو سایہ برگد جیسا قدرتی درخت دے سکتا ہے ایسا سایہ کوئی بھی مصنوعی درخت نہیں دے سکتا۔ یہ فلسفہ ہی ان کے صوفی ازم کی بنیاد تھا۔ اور جو عمارتیں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں وہ صدیوں اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔ صوفیا نے ہمیشہ لوگوں کی رہنمائی کی ہے اور ان کو سیدھی راہ دکھائی ہے۔ انہوں نے اپنے قول و فعل سے کر کے دکھایا ہے اور پھر ہی ان کے پیروکاروں نے اس پر عمل کیا۔ بانو قدسیہ بھی اپنے ڈراموں میں اس کا برملہ اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''نذیر: سر جی۔۔۔ ایک بات ہے۔۔۔
ہادی: ہاں بتاو؟ نذیر: میں تو کچھ نہیں جانتا پر میرا باپ امام مسجد تھا مسجد میں
ہادی: مسجد کا امام تھا؟ نذیر: جی سرکار۔۔۔ چھوٹا سا گاوں تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔۔۔ وہ کہا کرتا تھا احمقوں کمرے میں سے کاٹھ کباڑ نکال کر ہی سفیدی کرتے ہیں۔ تم جانے دل میں کیا کچھ بسائے رکھتے ہو۔ خالی کرو تو اللہ کے نام کی سفیدی ہو۔ دنیا کے محبوب کے لئے کتنا کچھ نکال پھینکتے ہو۔ نکالتے ہو کہ نہیں۔''(۱۸)

اشفاق احمد کی طرح بانو قدسیہ کی ڈراموں میں انسانیت کی بھلائی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے پیش نظر لوگوں کو اچھی و بری چیز میں امتیاز کروا کر نیکی کی طرف راغب کرنا تھا۔ وہ ہر صورت میں انسان اور معاشرے کی اصلاح پر کمربستہ نظر آتی ہیں۔ ان کا مقصد معاشرے کی ناہمواریوں کو نشان زدہ کر کے اس کا حل تلاش کرنا بھی تھا۔ انہوں نے عام آدمی کی زندگی سے اپنا رشتہ مضبوطی سے استوار رکھا۔ بانو قدسیہ کے کردار سچ بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سچ کو آنچ نہیں ہے۔ اس لئے کردار کتنا ہی بزدل ہو لیکن جب حق اور سچ بات کہنے کا معاملہ ہو تو پھر وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔ بانو قدسیہ کی ڈرامہ سیریز'' دیئے کی آنکھ'' کا ایک بزدل کردار ''بشیرا'' جو بظاہر بزدل ہے لیکن سچ بات کہتے ہوئے وہ بڑا دلیر بن جاتا ہے۔

''بشیر: کبھی اللہ تجھے توفیق دے دے ناں اپنے حکم ماننے کی تو دیکھ کیسی دلیری آتی ہے تیرے دل میں۔۔۔ چھاتی آپی پھول جاتی ہے اس کے حکم سے۔۔۔ کوئی مجھے سمجھا نہیں سکتا، منع نہیں کر سکتا۔۔۔ راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔''(۱۹)

اشفاق احمد کی تربیت کے زیر اثر بانو قدسیہ کے ہاں بھی انسان کی اپنی ذات سے پہچان کا سفر اللہ تعالیٰ کی پہچان پر ختم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی مخلوق کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا

ہے اور ایک ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرتی اور سماجی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ صوفی فلاح انسانیت کے ساتھ ساتھ خیر کی ترویج و اشاعت بھی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی زندگی میں راسخ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ تصوف اللہ والوں کی خاص خوبی ہے۔ صوفیا حضرات ہمیشہ اللہ سے لو لگائے رکھتے ہیں۔ بانو قدسیہ بھی اپنے ڈراموں میں جابجا اس کا ذکر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اللہ والوں کی شان ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں بلکہ وہ سوتے ہی بہت کم ہیں۔ ان کے ڈرامہ سیریل ''پیا نام کا دیا'' میں ایک باپ اپنی بیٹی کو صبح اٹھنے کی نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''کسی خاص بات کی نشانی نہیں ہیں۔ ہمارے استاد۔۔۔ مستور خاں اللہ انہیں غریق رحمت کرے ۔۔۔بڑے بھولے آدمی تھے ۔۔۔ ہمیشہ صبح کے وقت ریاضیت کراتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔۔۔بے وقوف! صبح کے ریاض میں اللہ کا نور بھی شامل ہوتا رہتا ہے۔ پرندوں کی آوازیں بھی ہوتی ہیں، سورج کی کرنیں بھی ہوتی ہیں، تو نے صبح کیوں اٹھنا چھوڑ دیا ستارہ۔''[۲۰]

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ چونکہ ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے دیگر کئی پہلوؤں کی طرح صوفی ازم بھی ان میں مشترک پہلو ہے۔ وہ فرد کا رشتہ نہ صرف معاشرے سے بلکہ اس کا رشتہ اس کی ذات سے بھی جوڑتے نظر آتے ہیں۔ اور اپنی ذات کے اندر سے جو جوہر تلاش کرتے ہیں اس کا رشتہ بیک وقت ظاہر سے باطن تک کے سفر پر محیط ہوتا ہے۔ وہ اردو ادب میں اپنی طرز کے خود ہی موجد ہیں اور یہ طرز انسان کی بنیادی ضرورت، جذباتی مسائل اور معاشرتی مسائل سے اہم تر ہے اور وہ انسان کی اپنی تلاش ہے۔ اس کے ظاہر کے نہیں بلکہ باطن کے حالات ہیں۔ اور باطن کے اس سفر میں روح سے رابطہ ہے اور اس سفر کی ابتدا اس کی اپنی ذات اور انتہا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

حوالہ جات

1. Daily, Dawn, 17th September, LHR,2004, P:17

۲۔ اشفاق احمد، ننگے پاؤں، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،لاہور، ص۔۵۵

۳۔ ایضاً، ص،۴۷۹

۴۔ ایضاً، ص،۴۸۰

۵۔ اشفاق احمد، مہمان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۰، ص: ۱۳۸

۶۔ اشفاق احمد، بند گلی، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳، ص:۵۷

۷۔ اشفاق احمد، بند گلی، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳، ص: ۱۹۰

۸۔ اشفاق احمد، بند گلی، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳، ص: ۲۲۱

۹۔ ایضاً، ص: ۵۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۵۳۰

۱۱۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا،(پیش لفظ، بنجارے کی ہانک)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶، ص:۵

۱۲۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا،(پیش لفظ، بنجارے کی ہانک)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶، ص:۵

۱۳۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا،(پیش لفظ، بنجارے کی ہانک)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶، ص:۷

۱۴۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶، ص:۲۳۵

۱۵۔ اشفاق احمد، من چلے کا سودا، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶، ص:۳۲،۲۴

۱۶۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم،(دھوپ جلی)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵، ص: ۱۶،۱۵

۱۷۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم،(کچاراستہ)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵، ص:۵۱

۱۸۔ ذوالفقار احسن، سماہی اسالیب،(شمارہ نمبر ۲۴)، سرگودھا، اپریل تا جون،۲۰۱۷، ص:۲۰

۱۹۔ بانو قدسیہ، دوسرا قدم،(دیئے کی آنکھ)، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵، ص:۱۶۳

۲۰۔ بانو قدسیہ، پیا نام کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳، ص: ۴۳